جناب احمد ندیم قاسمی
معروف شاعر و دانشور

اکیسویں صدی کا پیغام

اکیسویں صدی کا استقبال کرتے ہوئے ہم صرف اس صورت میں بھلے لگ سکتے ہیں کہ ہمارے ذہنوں اور ضمیروں میں ان ناکامیوں کا مکمل احساس وشعور موجود ہو جو بیسویں صدی میں ہمارا مقدر تھیں۔ پھر ان ناکامیوں کے اسباب و مضمرات کا قلع قمع کرنے کے پختہ ارادے' اور ان کامرانیوں کو مزید صیقل و تاباں کرنے کے عزم صمیم ہی سے ہم اکیسویں صدی کی طرف اعتماد کے ساتھ قدم بڑھا سکتے ہیں۔ ہماری اخلاقی روایات میں آیا ہے کہ جب دن بھر کی دوڑ دھوپ اور تگ ودو کے بعد تم آرام کرنے کیلئے بستر پر لیٹو تو سونے سے پہلے اپنے اعمال واقوال کا خود ہی محاسبہ کرو کہ طلوع آفتاب کے بعد اب تک تم سے کون کون سے غلطیاں سرزد ہوئیں اور تم نے کون کون سے اچھے کام کئے اور پھر اپنے آپ سے یہ طے کرنے کے بعد ہی سوؤ کہ آئندہ تم ان غلطیوں کا اعادہ نہیں کروگے اور ان اچھے کاموں کو نہ صرف ہمیشہ کیلئے اپنالوگے بلکہ انہیں مزید نکھار دو اور سنوار دوگے۔ یہ ایک فرد کی زندگی میں ایک دن کا معاملہ تھا مگر ایک صدی تو چھتیس ہزار سے بھی زیادہ دنوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کا حساب افراد اور اشخاص کے علاوہ قوموں اور ملتوں کو رکھنا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا محاسبہ بھی تو بحیثیت قوم ہمیں کو کرنا ہے کہ بیسویں صدی میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا اور کیوں کھویا اور کیسے پایا؟ اور یہ بھی تو طے کرنا ہے کہ اس صدی میں ہم نے جو کچھ کھویا' اسے نئی صدی میں پانے کی کوشش کریں گے اور بیسویں صدی میں ہم نے جو کچھ پایا' اسکا اکیسویں صدی میں جی جان سے تحفظ کریں گے اس طرح کے کسی فیصلے کے بغیر بیسویں صدی کے بعد اکیسویں صدی ہمارے لئے اسی طرح بے معنی ہو کر رہ جائے گی جیسے ایک شکست خوردہ اور مایوس شخص کے لئے منگل کے بعد بدھ کا دن بھی منگل کی طرح بے معنی ہوتا ہے۔

ان دنوں صرف ممالک اسلامیہ ہی میں نہیں' بلکہ پورے کرہ ارض پر احیائے اسلام کے چرچے ہیں یورپ اور امریکہ تک کے براعظموں میں وہاں کے دانشور اور رائے عامہ کو متاثر کرنے والے عناصر سوچنے لگے ہیں کہ ایشیاء اور افریقہ کے مسلمانوں کو صدیوں تک اپنے استعمار واستبداد کی گرفت میں اسیر رکھنے کے باوجود' اسلام کا جذبہ' مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں میں کیوں زوال پذیر نہیں ہو سکا۔ اور یہ چار طرف سے اسلام کے بڑھتے ہوئے قدموں کی دھمک سی کیوں سنائی دے رہی ہے۔ چنانچہ یہ راز معلوم

کرنے کے لئے قرآن وحدیث اور اسلامی فقہ اور اسلامی تہذیب کا از سر نو مطالعہ کیا جارہا ہے۔ اسلامیات کے سلسلے میں تحقیقی مراکز قائم ہورہے ہیں اور مغرب کے متعصب مورخین کی پھیلائی ہوئی تاریکی سے بچ کر' اسلام کو حقیقت وصداقت کی روشنی میں پرکھا اور جانچا جانے لگا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اسلام کے سے سچے 'کھرے' پاکیزہ اور منصفانہ ضابطہ حیات کا مطالعہ بے تعصبی کی فضا میں ہوگا تو مطالعہ کرنے والوں کا اسلام سے متاثر ہونا ناگزیر ہو جائے گا۔ چنانچہ یورپی اور امریکی ممالک میں ہزاروں لاکھوں افراد متاثر ہورہے ہیں اور الحاد اور بے یقینی اور بے مذہبیت کی دھن میں سے فی الحال وہ خود نہیں تو ان کے دل اور دماغ نکلتے آرہے ہیں یہ اسلام کی عالمگیریت کے واضح امکان کا ایک بلیغ اشارہ ہے' مگر اس مبارک امکان کو صرف اس طرح حقیقت میں بدلا جاسکتا ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے مسلمان اپنی زندگیاں آنحضرت ﷺ کے ارشادات عالیہ کے سانچے میں ڈھال لیں' دلوں پر سے توہمات کی گرد جھاڑ دیں۔ عقائد کو مصفی اور منزہ کرلیں اور حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ کی تمثالیں بن جائیں۔ اکیسویں صدی میں اگر ہم مسلمان اپنے اندر صحیح اور سچا اسلامی انقلاب پیدا کرلیں تو وہ مقدس ومبارک خواب بھی ہمکنار تعبیر ہوسکتا ہے' جو سید جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال نے بیسویں صدی میں دیکھا تھا۔ یہ کرہ ارض کے تمام مسلمانوں کے ایک امت' ایک ملت بن جانے کا خواب ہے۔

بیسویں صدی میں بظاہر سیاسی طور پر آزاد ہونے کے باوجود دوسرے افریشیائی ممالک کی طرح پاکستان کو بھی مغرب کی تہذیبی اور اقتصادی یلغار کا سامنا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم اکیسویں صدی کے ابتدائی پندرہ برسوں میں تو یہاں کی تہذیب وثقافت اور معاشرت ومعیشت پر مغرب کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ قرضوں کے چکر میں ڈال کر ہمیں صدفی صد امریکہ اور یورپ کا دست نگر بنادیا گیا ہے اور ہمارے لئے کوئی راہ فرار رہنے ہی نہیں دی گئی۔

اقتصادیات ومعاشیات کے حوالے سے مغرب نے ہمیں آزاد ہونے کے باوجود جس طرح اپنا محتاج بنا رکھا ہے اسکے مضمرات سے ان مضامین کے ماہرین ہی بہتر طور پر نمٹ سکتے ہیں۔ ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے مجھے پاکستان کے تہذیبی مستقبل سے بطور خاص دلچسپی ہے۔ پاکستانی آبادی کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے اسلامی تہذیب یہاں کے اہل ادب کا خاص موضوع ہے اور اس تہذیب کو بیسویں صدی میں جن خطرات کا سامنا تھا۔ اب سائنس کی ٹیکنیکل ترقی نے ان خطرات میں صدفی صد اضافہ کردیا ہے۔ چنانچہ اکیسویں صدی میں اسلامی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لئے بڑی لگن اور محنت درکار ہوگی اور اس سیدھی سادی' سچی' کھری' جری اور پختہ شخصیت کو صورت پذیر کرنا ہوگا' جو ان بنیادی عقائد کی پیداوار ہوگی' جن میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ کوئی دھندلاہٹ نہیں' کوئی پراسراریت

نہیں۔ اس شخصیت کی توانائی اس کی سادگی ہے اور مساوات واخوت اسکی شان ہے جسکے مطابق نہ رنگ و نسل کا کوئی امتیاز ہے اور نہ ذات پات کی کوئی تفریق۔ اسلام کی انصاف پروری اور عدل گستری بھی اس کی ایک بےمثال تہذیبی قدر ہے۔ اخلاق حسنہ اس کی ایک اور توانائی ہے جسکے مطابق معاف کر دینے اور درگزر سے کام لینے کی اخلاقی خوبصورتی نے آغازِ اسلام میں ایک دنیا کو موہ لیا تھا اور عقیدے صرف یقین کرنے یا تبلیغ کرنے کی چیز نہیں ہوتے، عمل کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ہمیں ایک ایسا خطہ ارض میسر آگیا تھا جس میں ہم اسلامی تہذیب اور جدید علوم کی وجہ سے صورت پذیر ہوتے ہوئے تمدن کے ارتباط واختلاط کی ایک جنت تعمیر کر سکتے تھے۔ مگر خدا کی وحدانیت کے پرستار ہونے کے باوجود ہم غیر اللہ کے خوف سے بے نیاز نہ رہ سکے۔ اسلئے ہماری شخصیت مستحکم اور مستغنی نہ ہو سکی۔ اپنی طرف سے کچھ عرض کرنے کی بجائے مجھے پاکستان میں اسلامی تہذیب کی صورت حال کے بارے میں چند سوال پوچھنے کی اجازت دیجئے:

کیا بیسویں صدی میں ہم نے اپنے دین کو کھرا اور سادہ اور غیر پیچیدہ رہنے دیا ہے؟

کہیں ہم نے اسے دھندلا اور پراسرار تو نہیں بنادیا؟

کہیں ہم نے اصلی اور نسلی مسلمانوں کی تفریق تو پیدا نہیں کر دی؟

کہیں ہم اپنے ایمان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اسلام کی معاشرتی اور معاشی مساوات واخوت کے اصولوں پر عمل پیرا ہیں؟ کیا ہم ذات پات اور برادری قبیلے کے امتیازات سے بلند ہو سکے ہیں؟

کیا ہم منصف اور عادل ہیں؟ کیا ہم دین میں جبر واکراہ کی ممانعت کا احترام کرتے ہیں؟

کیا ہم معاف کر سکتے ہیں؟ کیا ہم میں درگزر کرنے کا حوصلہ ہے؟

کیا ہم برائی کے بدلے نیکی کا برتاؤ کر سکتے ہیں؟ کیا ہم نے "الارض للہ" کے ارشاد کا عملاً احترام کیا ہے؟

کیا ہم نے (قرآن کے حکم) "قل العفو" کا کوئی عملی پیمانہ وضع کیا ہے؟

اگر ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی ہی میں ہے، تو کیا ہمارے تہذیبی نصب العین اور ہمارے عمل کے درمیان پہاڑ حائل نہیں ہو چکے ہیں؟ اور کیا اکیسویں صدی میں بھی ہم اپنی تہذیب کے ساتھ یہی بدسلوکی کرتے رہیں گے؟ اگر ہم اپنے افکار وخیالات کو تخلیق واجتہاد سے روشناس کرادیں اور اس جرأت مندانہ اجتہاد کے ذریعے اسلامی تہذیب کو ایک جیتی جاگتی، سانس لیتی اور دھڑکتی ہوئی تہذیب بنادیں جس کے باطن میں بڑی فراخی ہو اور جس کے ظاہر میں جلال وجمال برابر برابر تناسب سے جلوہ گر ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ اکیسویں صدی میں پوری دنیا پاکستان کو اسلامی تہذیب کی تجسیم نہ کہنے لگے اگر ہم سکڑے اور سمٹے ہوئے کرہ ارض میں کارفرما تازہ دم اور تازہ کار عناصر کو محتسبانہ غصے میں

آکر ایک دم منسوخ و ممنوع قرار دینے کے بجائے انہیں اپنے دینی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کر اپنانے کا عمل جاری کر دیں تو ہم اسلامی تہذیب کا صحیح معنوں میں احیا کر سکیں گے اور ان غیر ملکی اثرات سے بھی محفوظ ہو جائیں گے جنھوں نے ہمیں نقالی اور بے عملی اور بے ہنری کے سوا اب تک کچھ بھی نہیں دیا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام میں ملوکیت کے در آنے سے اس دین فطرت کو کتنا شدید نقصان پہنچا اور مسلمانوں کے مزاج' ابتدائی صاف ستھرے اسلامی سانچوں کو توڑ کر کس طرح انتشار کی زد میں آگئے۔ اس انتشار نے مسلمانوں کے اندر یقین اور اعتماد کی قوتوں کو کمزور کر دیا تو مغرب کا سامراجی دیو' اپنی ناپاک نو آبادیاتی مہم پر نکلا اور ایشیا اور افریقہ کو صدیوں تک کے لئے غلام بنالیا گیا۔ یاد رہے کہ محکومی اور غلامی کی نوعیت صرف سیاسی نہیں ہوتی' یہ تو براہ راست ایمان وایقان پر حملہ آور ہوتی ہے۔ تہذیبوں اور ثقافتوں کو بد شکل بناتی ہے۔ نمود و نمائش اور دجل و فریب کو سکہ رائج الوقت قرار دیتی ہے۔ اور یوں اخلاق و کردار کو اس حد تک متغیر کر دیتی ہے کہ ہر پرانی قدر (چاہے وہ اچھی ہو) بد ہیت اور ہر نئی شکل (چاہے وہ بری ہو) پر جمال دکھائی دینے لگتی ہے۔ برطانوی اور فرانسیسی اور ولندیزی اور یورپ کے دیگر استعماروں نے دوسرے ملکوں کے لوگوں کے ساتھ بھی اور بطور خاص مسلمانوں کے ساتھ یہی غیر انسانی برتاؤ روا رکھا اور مسلمانان عالم زوال کے آخری نقطے تک اتر گئے۔ مذہب کی جگہ توہمات نے لے لی۔ اتحاد کی جگہ افتراق نے لے لی۔ امت مسلمہ کی یک جہتی کی جگہ فرقہ بندیوں اور گروہ بازیوں نے لے لی۔ مگر رات کی ظلمت میں ستارے بھی تو چمک اٹھتے ہیں اور حد نظر تک پھیلے ہوئے لق و دق ویرانوں میں گل لالہ بھی تو کھل اٹھتے ہیں۔ چنانچہ یہ اعزاز بھی اس بیسویں صدی ہی کو حاصل ہے کہ اس میں غلامی پر رضامند لوگوں کے درمیان غلامی کی زنجیریں توڑنے والے بھی پیدا ہو گئے اور محکومی کے خلاف ایشیاء اور افریقہ میں اس زور کی تحریکیں چلیں کہ قریب قریب ساری اسلامی دنیا آزادی کی نعمت سے سرفراز ہو گئی۔ یقیناً ان ممالک کی یہ آزادی سامراجی قوتوں کو سخت ناپسند تھی۔ کیونکہ اس طرح ان کے مفادات متاثر ہوتے تھے جو محکوم ممالک کے اقتصادی استحصال سے انہیں حاصل تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سیاسی گرفت کے ٹوٹتے ہی ان نو آزاد ممالک کو اپنی سیاسی گرفت سے بھی زیادہ خطرناک' اقتصادی گرفت میں دبوچنے کا منصوبہ بنایا اور آج کل ایشیاء اور فریقی ممالک میں اسی منصوبے پر عمل ہو رہا ہے اور امریکہ کا نیا عالمی نظام اسی منصوبے کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے۔ مگر خود آگاہی بڑی نعمت ہے اس لئے آخر کار اس اقتصادی گرفت کو بھی ٹوٹنا ہے اور انشاء اللہ اکیسویں صدی کے آغاز ہی میں ٹوٹنا ہے۔

سید جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کی تمنا تھی کہ اسلامی ممالک بے شک اپنی جغرافیائی اور ثقافتی انفرادیتیں برقرار رکھیں' مگر ان سب ملکوں کو ایک لڑی میں پرونے کے لئے اور ان بکھرے ہوئے

کروڑوں مسلمانوں کو ایک ملت بنانے کے لئے مجلس اقوام کے انداز کی ایک مجلس ممالک اسلامیہ وجود میں آئے جس کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کو یک جہتی، ہم آہنگی باہمی تعاون، برداشت اور بھائی چارے کا منشور دیا جائے۔ اور یہ منشور اول و آخر قرآن مجید کے احکام مقدسہ اور حضور ﷺ کے ارشادات گرامی پر مشتمل ہو۔ جب تمام دنیا کے مسلمانوں کا خدا ایک ہے، رسول ایک ہے، قبلہ ایک ہے، شریعت ایک ہے، منتہائے نظر ایک ہے تو سیاسیات اور معاشیات میں ان کا ایک رخ کیوں معین نہ ہو۔ صرف اس صورت میں مسلمانوں کا مستقبل بھی محفوظ رہ سکتا ہے اور کرہ ارض پر پھیلی ہوئی احیائے اسلام کی تحریکیں بھی کسی مثبت نتیجے تک پہنچ سکتی ہیں اور بڑی عالمی طاقتوں کی روندی ہوئی اس دنیا میں امن، سلامتی، خوشحالی، عدل، مساوات، محبت اور اخوت کی ابدی فضا بھی قائم ہو سکتی ہے

یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ بیسویں صدی گزار کر بھی عالم انسانیت خاص طور سے افریشیائی ممالک آج بھی قریب قریب انہی مسائل سے دوچار ہیں، جن کا سامنا انہیں انیسویں صدی کے خاتمے کے دنوں میں تھا۔ بیسویں صدی میں ایشیاء اور افریقہ کے بیشتر ممالک نے فرنگیوں کی گرفت سے آزادی تو حاصل کر لی مگر آج بھی جب یورپ اور امریکہ کا کوئی اخبار یا رسالہ افریقہ اور ایشیاء کے سیاسی، معاشی، اقتصادی اور تہذیبی مسائل کا جائزہ لیتا ہے تو بے تعصبی اور انسان دوستی کے ہزار دعوؤں کے باوجود اسکے لہجے میں تحکم کی وہ گونج ضرور ہوتی ہے جو مغرب کے ہاتھوں گزشتہ دو تین صدیوں میں افریشیا کے استحصال کا نتیجہ ہے یہ جائزہ مغرب کی صنعتی اور اقتصادی ترقی کے مینار کی چوٹی پر بیٹھ کر لیا جاتا ہے۔ اور افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے کہ افریشیائی ممالک مغرب کی طرف سے تفویض ہوئی آزادی کی کوئی قدر نہیں کر سکے اور وہاں کے لوگوں کو حکومت چلانا آتا ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل مغرب کے لاشعور میں ابھی تک یہ جذبہ قیامت برپا کئے ہوئے ہے کہ افریشیائی ممالک کو ابھی مزید ایک صدی تک غلام رہنا چاہیے تھا اور انہیں بھی اس آسودگی کا تجربہ حاصل کرنا چاہیے تھا۔ جس کا لطف ان کے آباؤ اجداد نے اٹھایا اور جس کی شان و شوکت کا حال وہ تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ کیسے وہ پھٹے حالوں اور نو آبادیوں میں گئے اور کیسے زر و جواہر سے لدے پھندے واپس آئے اور خطاب پائے اور جاگیریں حاصل کیں۔

بیسویں صدی میں مغرب کے حکمرانوں، سیاست دانوں اور دانشوروں کو افریشیائی ممالک کی آزادی سے بڑی تکلیف پہنچی ہے اور وہ ان ملکوں کی آزادی کو کسی نہ کسی صورت میں ملوث رکھنا چاہتے ہیں اور ستم یہ ہے کہ ان کی یہ ناپاک کوشش خاصی کامیاب ہے۔ جن لوگوں کے ذہنوں میں افریشیا کی حکمرانی کا خمار اب تک موجود ہے، وہ یہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں انہیں وہی لوگ اپنے برابر بیٹھے نظر آئیں جن پر کل تک وہ حکم چلاتے تھے اور حکم عدولی کی صورت میں انہیں سزائیں دیتے

تھے۔ وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس عالمی پلیٹ فارم پر افریشیا کے سانولوں اور کالوں پیلوں کی تعداد مغرب کے گوروں سے بڑھ جائے گی اور ووٹ سے طے ہونے والے مسائل پر انہیں افریشاء کے مقابلے میں شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سو انہوں نے ان خطرات کے پیش نظر اقتصادی امداد اور سیاسی تعاون اور اسلحاتی تحفظ وغیرہ کے ڈھونگ رچائے اور آج اسی کے میٹھے پھل کھا رہے ہیں۔ اقوام متحدہ میں افریشیاء کے سب سے بڑے ملک چین کی رکنیت کا مسئلہ پیش ہوتا تھا۔ تو خود بعض افریشیائی ممالک بھی چین کے خلاف ووٹ دیتے تھے اور جب افریشیاء کے دو اہم ترین ملکوں پاکستان اور ہندوستان کا ایک ایسا تنازعہ پیش ہوتا جو ان دونوں براعظموں کے امن کو تباہ کر سکتا تو خود افریشیاء ہی کے بعض ملک غیر جانبداری کے بے معنی اور فراری طرز عمل اختیار کر لیتے تھے۔ اور جب وہ ایسا کرتے تھے تو انہیں یہ احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسی مغرب کے مقاصد کو آگے بڑھا رہے ہیں جس نے انہیں صدیوں تک لوٹا' پیٹا اور نوچا کھسوٹا ہے' جس نے ان کی تہذیبوں کو مسخ کیا ہے اور ان کی تاریخ کے مفہوم ہی بدل دیئے ہیں۔ جس نے ان سے ان کی زبانیں' ان کی روایتیں اور ان کی قدریں چھین لی ہیں اور جس نے انہیں سیاسی آزادی دینے کے بعد افریشیاء کو اپنی تہذیبی نو آبادی بنا رکھا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے ایسے ملکوں کو اپنی زیر زمین قسم کی سرگرمیوں کے اڈے بھی بنا رکھا ہے۔ جہاں کے حکمران آزادی کے بعد اپنی قومی انفرادیتوں کے احیاء میں مصروف ہیں۔ وہاں "دکھائی نہ دینے والی" قوتیں ان لوگوں کے درمیان اندھادھند دولت بانٹتی پھرتی ہیں جو ایک بنگلے ایک کار اور مغرب کے ایک "ٹور" کے لالچ میں اپنی قوم کا مستقبل تک داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرنی چاہیے کہ بیسویں صدی عیسوی کے کم وبیش نصف نے ہمیں آزاد ہوتے تو دیکھا مگر ہم اب تک اپنے مقدر اور اپنے مستقبل کے صحیح معنوں میں مالک نہیں بن پائے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے انجام پر آزاد ممالک اسلامیہ کا منظر کچھ ایسا حوصلہ افزا نہیں ہے مگر اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ہم لوگ ابھی تک اپنی قدیم غلامانہ ذہنیت سے خلاصی حاصل نہیں کر سکے اور نہ صرف ملکوں ملکوں اور قوموں قوموں میں بلکہ فرقوں فرقوں اور قبیلوں قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ملت واحدہ کی اس منزل سے ابھی بہت دور ہیں جس کی نشان دہی قرآن پاک میں بار بار ہوئی ہے۔ اگر ہم مختلف ملکوں میں رہ کر ابھی ایک ہی ملت اسلامیہ کے فرد ہوتے تو چند لاکھ اسرائیلیوں کی کیا مجال تھی کہ وہ اپنے تین طرف پھیلے ہوئے عرب ممالک کو خاطر ہی میں نہ لائیں۔ اور اسلامی ممالک اس ایک دشمن سے نپٹنے کی بجائے آپس میں ہی دست وگریباں رہیں۔ اگر ہم ایک ملت ہوتے تو سویت یونین کو یہ جرأت کیسے ہوتی کہ وہ اپنی فوجیں یوں دھڑلے کے ساتھ

افغانستان میں داخل کر دیتا۔ جیسے امریکہ نے ویت نام میں اور پھر عراق میں داخل کی تھیں۔ یا ایران اور عراق اپنے مسائل حل کرنے کی بجائے ایک دوسرے پر کیوں پل پڑتے' یا بھارت پاکستان کا ایک بازو یوں آسانی سے کیسے کاٹ کر الگ کر لیتا اور دوسرے اسلامی ممالک چپ چاپ کیوں دیکھتے رہ جاتے' یا کشمیر کا مسئلہ خود ممالک اسلامیہ کے سامنے سرد خانے میں کیوں منتقل ہو جاتا اور اہل کشمیر اپنے بنیادی حقوق حاصل کرنے کیلئے جو بے مثال قربانیاں برسوں سے دے رہے ہیں ان کی طرف سے اقوام متحدہ منافقت کا ریکارڈ کیوں قائم کرتی۔

مگر اس طرح کی صورت حال کا یہ مطلب یقیناً نہیں ہے کہ ہم مستقبل سے مایوس ہو جائیں اور منزل تک کی طویل مسافت کو طے کرنے کی بجائے پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں۔ اکیسویں صدی ہمیں خبر دار کر رہی ہے کہ وقت گزرا جا رہا ہے اور وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا اگر ہمیں ایک شان اور ایک وقار سے زندہ رہنا ہے تو ہم صرف باہمی اخوت اور تعاون ہی کی صورت سے زندہ رہ سکتے ہیں' چنانچہ ہم میں سے ہر فرد کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ اپنے حلقہ اعزہ اور دائرہ تعارف میں' ممالک اسلامیہ کے درمیان اس اخوت کی شدید ضرورت اور زبردست اہمیت کو اپنے قول و فعل سے واضح کرتا رہے اور یوں ملت واحدہ کی منزل کو ہر سانس کیساتھ قریب تر لاتا رہے۔ اکیسویں صدی عیسوی میں اگر مسلمانان عالم کو ایک آن اور انا کیساتھ زندہ رہنا ہے تو پھر اسلامی نشاۃ ثانیہ کے منشور کی سب سے پہلی اور سب سے ضروری شق یہی ہے۔

(بشکریہ العارف' لاہور)

دروس الکافیہ

پشتو شرح کافیہ ابن حاجب رحمہ اللہ

افادات مولانا حافظ محمد ابراہیم فانی مدرس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

قیمت : ۱۰۰ روپے

ناشر : موتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ